عربوں کا ورثہ*

فواد عجمی

۱۹۸۰ء کے عشرے کے وسط میں عرب قومیت کی بنیاد پر تعمیر کردہ عرب کلچر کے پردے میں مطلق العنان حکمرانوں نے عربوں کو ایک اندھی گلی میں داخل کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی سیاست ایک طوفان کی طرح چھا گئی اور سیکولر عرب ہاتھ پاؤں مارتے رہ گئے۔ اب ان کا دور واپس آنا ناممکن ہے اور عرب ایک اہم سیاسی ورثہ سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔

جارج انتونیو، جس نے عرب قومیت کو اپنی کتاب ''عربوں کی بیداری'' (The Arab Awakening) کے ذریعے ایک منشور عطا کیا، قدیم یونانی چرچ کا ایک لبنانی پیرو تھا لیکن اس کی تعلیم کیمبرج میں ہوئی تھی۔ انتونیو کے مخاطب مغربی دنیا کے لوگ تھے اور اس نے مغربی دنیا ہی سے انصاف کی اپیل کی تھی۔ اس کا موضوع پہلی جنگ عظیم کے بعد مغربی طاقتوں کی طرف سے عربوں کی سیاسی تقسیم کے ذریعے وہ بدعہدی تھی جو عرب قومیت کی بنیاد بنی تھی۔ عرب قومیت کی ابتدا اینگلو امریکی تعلیمی اداروں بالخصوص ان کے سرخیل، سیرین پروٹسٹنٹ کالج (جو بعدازاں امریکن یونیورسٹی آف بیروت کہلایا) میں ہوئی۔

عربوں کی بیداری کا خواب قدیم معاشرتی بندھنوں سے آزادی کا خواب بھی تھا۔ انتونیو کی کتاب کی اشاعت سے دس برس پہلے بیروت کی ایک مسلم خاتون، ناظرہ زین الدین نے حجاب اور اس سے نجات ''السفور والحجاب'' کے نام سے ایک دلیرانہ کتاب لکھی تھی۔ جس میں اس نے اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے مسلمان عورتوں کے اس حق کی وکالت کی تھی کہ وہ حجاب سے

---

* Fouad Ajami, "The Arab Inheritance", *Foreign Affairs*, Vol. 76, No. 5, Sept/Oct. 1997, pp. 133 - 148

(تلخیص: عبداللطیف الفت)

نجات حاصل کرسکیں۔ اس نے اس سلسلے میں قدیم مذہبی رجحانات رکھنے والوں پر کڑی تنقید کی۔ اس کا کہنا تھا کہ عرب معاشرے میں کپڑے کے نقاب سمیت چار حجاب ہیں۔ دوسرے تین حجاب جہالت، منافقت اور جمود ہیں۔ اور عرب خواتین کو ان سب سے چھٹکارا پا کر ماضی سے تعلق توڑنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرنا چاہئے۔ وہ اس منصوبے کی پیروی کرنا چاہتی تھی جس کے تحت عربوں کے پڑوس میں مصطفےٰ کمال اتاترک ترکوں کو ایک جدید سیاسی اور معاشرتی کلچر سے متعارف کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۹۵۶ء کی جنگ سویز کے اثرات کے تحت عرب نوجوان سیاسی اور معاشرتی تجدید کے ایک نئے نفسیاتی سلسلے سے روشناس ہوئے۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ نے اس کی تبدیلی کی ابتدا کردی۔ اس جنگ سے ایک نسل کے خواب چکنا چور ہوگئے اور عرب قومیت کے تصوراتی ڈھانچہ میں جو ایک مشترکہ سیاسی ورثہ اور مقدر سے عبارت تھا دراڑیں پڑ گئیں۔ دارصل یہ تصور بنیادی طور پر ہی غلط تھا کیونکہ اس کی تشکیل میں تاریخی حقائق سے صرف نظر کیا گیا تھا۔ اس نے عملاً مسلم اور عیسائی عربوں کی تاریخی مخاصمت پر لیپا پوتی کر کے اسے چھپایا تھا اور علویوں، دروزوں اور شیعوں کو بھی نظر انداز کیا تھا۔ اس کا انحصار بھی عشرۂ رفتہ میں مصر کی ابھرتی ہوئی قوت پر تھا اور جب مصر خود ہی اپنی دنیا میں سمٹ گیا تو اسے سخت دھچکا لگا۔

۱۹۵۶ء کی جنگ سویز کے اثرات کے تحت عرب نوجوان سیاسی اور معاشرتی تجدید کے ایک نئے نفسیاتی سلسلے سے روشناس ہوئے۔

عرب قومیت کی تحریک کو اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل کے خلاف فوجی کامیابی اور تیل کی دولت کی اچانک نمود نے جزوی طور پر زندگی عطا کی اور ایسا لگتا تھا کہ دولت کی قوت سے سیاست کی شکل بدل جائے گی۔ لیکن اس عشرے کے آخر میں مشرق کی دنیا میں ایک نئے نقیب کا ظہور ہو چکا تھا۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی نے اس خوفناک راز کو آشکارا کر دیا جو عربوں کے علاقوں میں اسلام کی صورت میں موجود تھا اور اس طرح شیعوں اور سنیوں کے درمیان خط امتیاز کو بے معنی کر دیا۔ شیعہ تو

عرب قومیت کی تحریک کو اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل کے خلاف فوجی کامیابی اور تیل کی دولت کی اچانک نمود نے جزوی طور پر زندگی عطا کی۔

اس مسلح امام کا اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہی تھے۔ عربوں کے لئے بھی اسی کے ظہور کے بعد دینی سیاست میں انتہائی کشش پیدا ہوگئی۔

اگست ۱۹۹۰ء میں عراق کے صدر صدام حسین نے کویت پر چڑھائی کردی۔ لوٹ مار اور دہشت کے پردے میں یہ حملہ بھی عربوں کی حیاتِ نو کے دیرینہ خواب کی تعبیر نظر آتا تھا۔ صدام نے جب عجمی اور شیعہ طاقت کے خلاف نبرد آزمائی شروع کی تھی تو وہ عربوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا اور اس کی مکمل تائید کی گئی۔ اس دور میں مشرقی یورپ میں توڑ پھوڑ کا عمل جاری تھا اور دنیا کا نظام بدلتا ہوا نظر آرہا تھا۔ عربوں کو صدام جیسے مستبد حکمران نے مایوسی اور الجھنوں سے نکلنے کی راہ دکھائی لیکن اس کی شکست نے صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہونے دی۔

- صدام نے جب عجمی اور شیعہ طاقت کے خلاف نبرد آزمائی شروع کی تھی تو وہ عربوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا۔
- عربوں کے ورثہ نے دو شکلیں اختیار کرلیں۔ مطلق العنانی اور سیاسی اسلام

اس اثنا میں دو نئے عناصر عربوں کی سیاست میں داخل ہوئے، جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایک طرف تو امریکی اثر و رسوخ نے برطانیہ کی جگہ لے لی اور دوسری طرف اسلام ایک سیاسی قوت کے طور پر ابھرا۔ غیروں کی مداخلت نے عرب مرد و زن کو اپنی روایات کو نئے سانچے میں ڈھال کر اپنے قومی تقاضوں کو پورا کرنے کی قوت بخشی۔

عرب اس سے پہلے بھی متعدد مراحل سے گزرے تھے لیکن انہیں بُرے بھلے اور حلال حرام کی تمیز تھی۔ لیکن اب یہ سب حدیں پامال ہوگئیں۔ شام اور عراق میں حمص اور کردوں کے علاقوں میں جو خونریزی ہوئی وہ اس سے بالکل ناآشنا تھے۔ خود بیروت جیسے شہر میں جو عرب روشن خیالی کا مرقع اور رواداری اور آزاد خیالی کا نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ اس نوعیت کے مذہبی فسادات اور منتقمانہ کارروائیاں ہوئیں جن سے صاف ظاہر ہوگیا کہ مذہبی اختلافات پر جدّت اور دنیوی مفادات کا ایک نازک پردہ پڑا ہوا تھا جو چاک ہوگیا۔

عربوں کے ورثہ نے دو شکلیں اختیار کرلیں۔ مطلق العنانی اور سیاسی اسلام۔ سیاسی

منظر پر شکوک وشبہات اور مایوسی کی دھند چھا گئی اور عربوں کے سوچنے سمجھنے والے طبقے نے امریکہ اور یورپ کی راہ لی۔ جن ناپسندیدہ افراد نے بیروت میں پناہ لی تھی وہ ایک نئی ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ کچھ عرب صحافیوں نے پیرس اور لندن کو اپنا ٹھکانہ بنالیا اور وطن سے دوری نے ان کے لہجے میں تلخی اور جھنجھلاہٹ کو جنم دیا۔

ایک ناکام نسل

بیروت میں ابھرنے والے مذہبی رویوں کے بارے میں لبنان کے Waddahchrara نے لکھا ہے کہ یہ ''بن باپ کے بیٹے ہیں۔ ایران کے واقعات کی ایک بھونڈی نقل''۔ ماہرین عمرانیات اس تعریف میں انتفادہ میں شریک نوجوان لڑکوں، حماص کے کارکنوں اور شمالی افریقہ میں عرب دنیا کے دوسرے کنارے پر سرگرم الجزائر کے مسلح اسلام پسندوں کو بھی شامل کریں گے۔ الجزائر میں اسلام پسند اس کشمکش کو حزب اللہ اور حزب فرانس کے درمیان کشمکش کا نام دیتے ہیں۔

خستہ حال بزرگوں کی اس ناکام نسل نے انتفادہ میں شریک نوجوان اور بیروت کے خودکشی پر آمادہ ڈرائیوروں کو خوش آمدید کہا اور اپنی شکست تسلیم کر لی۔ عرب دنیا کے مقبول ترین شاعر نظار قابانی نے لکھا کہ ''اے غزہ کے فرزندو ہماری تحریروں کو وقعت نہ دو، ہم تمہارے اجداد ضرور ہیں لیکن ہماری پیروی نہ کرو، ہم تمہارے صنم ہیں لیکن ہماری پرستش نہ کرو''۔ قابانی کی یہ تحریر سیکولر نسل کے اعتراف شکست کی آئینہ دار ہے۔ گویا ایک ناکام سیکولر نسل دینی قوتوں کے لئے از خود میدان خالی کر رہی ہے۔

اسلام کی سیاسی تحریکوں کی کم مائیگی

غالباً ہم نے اسلامی سیاسی تحریکوں کی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ ان تحریکوں نے حد سے حد یہی کیا ہے کہ ایک غالب تہذیب کی پسپائی کے بعد اس کے پس ماندگان پر چڑھائی کر دی۔ حالانکہ نہ وہ اسے سو فیصد ختم کر سکتے تھے اور نہ ہی اس پر حاوی ہو سکتے تھے۔ خود ان کے لئے یہ

تکلیف دہ حقیقت تھی کہ ان کے اپنے اندر سے اس تہذیب کو نکالا نہیں جا سکا تھا۔ الجیریا کے اسلام پسندوں کو اپنے ملک کے فوجی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد فرانس کی سرزمین سے شروع کرنا پڑی۔ نابینا مبلغ عمر عبدالرحمان امریکہ کے شہروں نیوجرسی اور نیویارک سے حسنی مبارک کے خلاف نبرد آزما رہے اور معروف سعودی منحرف، محمد المصری، جنہوں نے جرمنی میں تعلیم پائی اور ایک امریکی بیوی کے شوہر ہیں، لندن سے، جو کفار کا شہر ہے، فیکس کی مدد سے سعودی خانوادے کی حکومت کا تختہ الٹنے اور سرزمین عرب کو کفار کے وجود سے پاک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ ان کی خام خیالی تھی کیونکہ صحرائے عرب میں معاشی خود کفالت نے جو کیفیت پیدا کر دی تھی اس کو تلپٹ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ادھر ہم نے اسلام کی سیاسی اپیل کو سمجھنے کے لئے اس کے روحانی اور الہامی ماخذوں کی طرف توجہ دی اور پوری ایک نسل ''اسلامی بنیاد پرستی'' کو سمجھنے میں لگی رہی۔ لیکن عرب دنیا میں اس قوت کے ابھرنے کی وجوہات سراسر مادی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دینی اور مذہبی عناصر کو اس وقت قوت حاصل ہوئی جب معاشی خوشحالی کا دور ختم ہوا اور اسے دھچکا لگا۔

گم شدہ عشرے

یورپ کے مستشرقین سے بالا بالا اب عرب اپنے روبہ زوال ادب میں اپنی روایات کے گرد گھوم رہے ہیں اور اپنی خستہ حالی کی وجوہات کے روحانی پہلو کو اجاگر کر رہے ہیں۔ حقیقت ان پر عیاں ہے اور انہیں کبھی کبھی اپنے بدیسی خیر خواہوں کی اس رائے سے بڑی تسلی ہوتی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے قلب میں بڑا اعتدال ہے۔ دوسری طرف ان کے دانشور اور علمی مرتبہ پر فائز اکثر مرد و زن عرب علاقوں سے ترک سکونت کر کے اجنبی سرزمینوں پر جا بسے ہیں۔ دونوں جنگوں کے درمیان جو حقیقت پسندانہ روش خیالی ابھری تھی اور جس کے تحت مذہب اور سیاست کی تفریق اور عقل و شعور کی بالادستی نے فروغ پایا تھا۔ پچھلے عشرے میں قصہ ماضی بن گئی ہے۔ تمثیلی طور پر سیکولر روایات کے حامل دانشوروں اور مفکروں نے طرح نو ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ لوگ جو عقل

کی بالادستی اور عوامی اور فکری دنیا میں اختلاف رائے کے قائل تھے اب اپنی وراثت میں پناہ لے رہے ہیں۔ عرب کبھی اپنی قوم پر نازاں تھے لیکن مطلق العنان حکومتوں نے ان سے یہ فخر چھین لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ گزشتہ نسلوں کے قوم پرستوں نے اس انداز کے نظام کے لیے جدوجہد نہیں کی تھی جو آج کل لیبیا، شام اور عراق میں نظر آتا ہے۔ یہ تو واضح طور پر ایک سیاسی روایت کے گم کردہ راہ ہونے کی علامت ہیں۔

خستہ حال بزرگوں کی اس ناکام نسل نے انتفادہ میں شریک نوجوانوں اور بیروت کے خودکشی پر آمادہ ڈرائیوروں کو خوش آمدید کہا اور اپنی شکست تسلیم کر لی۔

مہلک روایت

تیس برسوں میں عربوں کو چوتھی مرتبہ اچانک تلخ حقائق کا سامنا کرنے کا مرحلہ پیش آیا۔ یہ موڑ ان کے حالات میں عالمی منڈی کی قوتوں نے پیدا کیا۔ یہ پچھلے تینوں مراحل کے مقابلے پر سخت ترین مرحلہ تھا۔ ان میں پہلا مرحلہ ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ جنگ کا انجام تھا جس کا سامنا خاصی حکمت سے کیا گیا۔ عربوں کی جمہوری ریاستوں اور شہنشاہیتوں کے درمیان سرد جنگ کا خاتمہ ہو گیا اور چھ ہی برس بعد ایک معاملہ فہم فرزند زمین، انور سادات نے ایک نئی جنگ کے نتائج کو، اپنے ملک کو عرب سیاست سے علاحدہ کرنے کے لئے بڑی عیاری سے استعمال کیا۔ مصر نے ۱۹۷۳ء کے بعد عالمی حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور عرب دنیا میں داخلی کشمکش بھی ایک معتدل مقام پر آ گئی۔

دوسرا مرحلہ ایرانی انقلاب کا تھا جو رائج الوقت نظام کے خلاف خاصا جارح تھا۔ عربوں نے صبر سے کام لیا اور وقت گزارا۔ عراق کے اس سپہ سالار کی مدد کی جو اس مذہبی انقلاب کو اپنی حدوں تک محدود کرنے کے لئے سامنے آیا تھا۔ یہ حکمت عملی کامیاب تو رہی اور انقلاب کے اثرات نہ پھیل سکے، لیکن عربوں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ عراقی سپہ سالار کے حوصلے حدوں سے تجاویز کر گئے۔

تیسرا چیلنج ۱۹۹۰ء میں اس وقت پیش آیا جب صدام حسین نے خلیج پر اپنا تسلط جمانے کی کوشش کی۔ ماضی میں جھانکنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بحران کا نتیجہ ایک مقامی جابر حکمران اور

ایک غیر ملکی نجات دہندہ طاقت یعنی امریکہ کے درمیان جنگ کی صورت میں نکلا۔ عربوں پر بہت سے حقائق واضح ہو گئے، عرب ازم کا تصور پاش پاش ہو گیا۔ لیکن پانچ چھ سال گزرنے پر اس غیر ملکی طاقت کے بارے میں شکوک وشبہات نے جنم لینا شروع کر دیا جسے اول اول نجات دہندہ سمجھا گیا تھا۔ (T.E.Lawrence) نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ''ہر اجنبی نے عربوں کے درمیان اپنا بستر بچھانے کی کوشش کی ہے۔'' امریکہ جو اب اس علاقے کا چوکیدار بنا بیٹھا تھا اس سے مستثنیٰ نہ تھا۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ عراق کا ڈکٹیٹر تو بچ نکلا لیکن عراقی عوام پابندیوں کی زد میں آ گئے۔ یہ منطق عربوں کی سمجھ سے باہر تھی۔ چنانچہ ۱۹۹۶ء میں جب صدام نے امریکیوں کے متعین کردہ ''محفوظ علاقے'' کے کُردوں کے خلاف کارروائی کی تو امریکہ کو تن تنہا اس سے نبٹنا پڑا۔ حالات اتنے بدل چکے تھے کہ جو میزائل داغے گئے ان کے لئے عرب سرزمین کو استعمال نہ کیا جا سکا۔

دینی اور مذہبی عناصر کو اس وقت قوت حاصل ہوئی جب معاشی خوشحالی کا دور ختم ہوا اور اسے دھچکا لگا۔

عرب کبھی اپنی قوم پر نازاں تھے لیکن مطلق العنان حکومتوں نے ان سے یہ فخر چھین لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ گزشتہ نسلوں کے قوم پرستوں نے اس انداز کے نظام کے لیے جدوجہد نہیں کی تھی جو آج کل لیبیا، شام اور عراق میں نظر آتا ہے۔

اب چوتھا بحران اپنے اجزاء ترکیبی کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف نوعیت کا ہے۔ ۸۵-۱۹۶۰ء کی چوتھائی صدی میں جس سیاسی معاشی نظام نے عربوں کو نہایت آرام دہ زندگی گزارنے کے قابل بنایا تھا اب اس کی تبدیلی کا وقت آ گیا ہے کیونکہ زراعت سے اجتناب، محفوظ مارکیٹوں، پبلک سیکٹر، اور بالائی طبقوں کے لئے موزوں نظام تعلیم کی جن بنیادوں پر اسے استوار کیا گیا تھا اب وہ کمزور پڑ گئی ہیں۔ نئی دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر ایک بے رحمانہ عمل جراحی کی ضرورت ہے۔ ورلڈ بنک کی رپورٹ سے یہ خطرناک صورت سامنے آئی ہے کہ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کی معاشی صورت حال جمود کا شکار ہے۔ جس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اس خطے کے ۲۶۰ ملین باشندوں کے مقابلے میں فن لینڈ کے صرف ۵ ملین باشندے زیادہ مصنوعات برآمد کرتے ہیں اور یہاں کے عام کارکن کی آمدنی میں ۱۹۹۰ کے عشرے کے وسط میں ۱۹۷۰ء کے مقابلے میں کوئی حقیقی

اضافہ نہیں ہوسکا۔ ترقی پذیر دنیا میں منتقل ہونے والے نجی سرمائے کا صرف ایک فیصد اس علاقے میں آرہا ہے ۱۹۸۶ء سے اوسط نجی آمدنی میں ۲ فیصد کمی ہوئی ہے، جو ترقی پذیر علاقوں میں تیز ترین انحطاط ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک بھی اس صورت حالات سے مستثنیٰ نہیں ہیں کیونکہ ان کی فی کس عمومی پیداوار میں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء تک ۴ فیصد سالانہ کمی ہوئی ہے۔ گزشتہ دو عشروں میں خلیج کی عرب ریاستوں نے اپنا بیرون ملک سرمایہ خرچ کر ڈالا ہے جبکہ ان کی آبادی دگنی ہوگئی ہے۔ غربت نے ان کے دروازے پر دستک نہ بھی دی ہو حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ خوشحالی خواب بنتی جارہی ہے۔

تیل پیدا کرنے والے ممالک کی فی کس عمومی پیداوار میں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء تک ۴ فیصد سالانہ کمی ہوئی ہے۔
گزشتہ دو عشروں میں خلیج کی عرب ریاستوں نے اپنا بیرون ملک سرمایہ خرچ کر ڈالا ہے جبکہ ان کی آبادی دگنی ہوگئی ہے۔

یہ معاشی انحطاط تاجرانہ روایات کے حامل اس علاقے کے لئے تقدیر کا ایک تکلیف دہ مذاق ہے۔ روسی معیشت کے تہ و بالا ہو جانے کا سبب تو سرمایہ دارانہ طرز معیشت سے اجتناب کو قرار دیا جاتا ہے لیکن یہاں کی صورت حالات کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں تو حکومتوں کی پالیسیاں اس زوال کا باعث بنی ہیں۔ ریاستی ملکیت، ریاستی مالی اعانت اور ریاستی تحفظ کو جزوی طور پر ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہے لیکن گزشتہ دو عشروں کی جنگوں اور بدامنی کی کیفیت کی وجہ سے ۳۵۰ بلین ڈالر کا نجی سرمایہ بیرونِ ملک منتقل ہوگیا ہے، جس سے علاقے کی بدقسمتی پر گویا مہر لگ گئی ہے۔

اس سے پہلے دور میں مسلمانوں کی ریاستیں سرمایہ دارانہ نظام کے سامنے نہیں ٹھہر سکی تھیں، کیونکہ ان کا سامنا مضبوط سیاسی طاقت اور یورپ کی ارزاں مصنوعات سے پڑا تھا۔ چنانچہ بیرونی قرضے چھا گئے اور وہ سیاسی طور پر بھی غلام بن گئے۔ انیسویں صدی میں مغربی معیشت عثمانی سلطنت کی روایتی صنعتوں کو پامال کر رہی تھی۔ یہ مہلک سلسلہ اب بھی جارہی ہے۔ مفادات کے تحفظ اور علاقائی، گروہی اور نسلی تعصبات کی باہمی کشمکش میں بالادستی تعصبات ہی کو حاصل ہے۔ قوموں کی تاریخ اسی سانچے میں ڈھلتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہیں اور جس کے لئے وہ سعی کرتی

ہیں۔ عرب معاشرے نے اپنے سیاسی عمل سے معاشرتی امن اور معاشی خوشحالی کے مقابلے میں زیادہ دل خوش کن نتائج کی تمنا کی ہے۔

اب اس خطے کو غلامی سے بھی بدتر صورت حال کا سامنا ہے۔ اولاً اس علاقے میں سرمایہ کاری کے امکانات معدوم ہوتے جارہے ہیں، پھر یہاں کے کارکن اطمینان بخش حد تک پیداوار کے قابل نہیں اور آخر میں یہ کہ یہاں کی مصنوعات میں مقابلے کی صلاحیت ہی نہیں۔ عالمی سرمایہ داری کے اس دور میں عین ممکن ہے کہ پورے کے پورے ملک صفحہ ہستی سے مٹ جائیں اور فراموش کر دیے جائیں۔

اسلام پسندی کے بعد کی دنیا

عرب دنیا میں گزشتہ دو دہائیوں میں صورت حال کچھ اس طرح بدلی ہے کہ حکمران مطلق العنانی کے خواہاں اور ان کے مخالفین ان کی تعمیر کردہ ہر چیز کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر مُصر ہیں۔ اس تباہ کن رویے کے نتیجے میں قومیں زندہ تو رہ سکتی ہیں لیکن اس کی قیمت انہیں افلاس اور انحطاط کی صورت میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اب نجات کی صورت صرف معیشت کی بحالی ہی نہیں (اگرچہ یہ اولین شرط ہے) بلکہ زندگی کے بارے میں جدید رویہ اپنانے میں مضمر ہے۔

> اسلام پسندوں کی طرف سے تقویٰ اور پرہیزگاری پر مبنی، رنگینیوں سے خالی طرز زندگی سے خائف ہوکر متوسط طبقات نے مطلق العنان طرز حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا ہے۔

اسلام کی عظمت رفتہ کے بارے میں رومانوی تصورات نے خلا کو تو پُر کر دیا تھا جو قومی روایات کے زوال سے پیدا ہوا تھا لیکن یہ تھی خام خیالی اور ایک طرح کی بے راہ روی۔ کیونکہ اس کے ذریعے کچھ نئے طبقات نے جو نیم تعلیم یافتہ اور مایوسی کا شکار تھے اپنے ماحول کے بارے میں ایک عامیانہ حل تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

ایران کے انقلاب کے بعد عرب دنیا میں اسلامی احیاء کی تحریکوں اور ان کے مخالفین کے درمیان مخاصمت کے بعد ایک نئی نسل پروان چڑھ چکی ہے اور صد شکر کہ ان متصادم قوتوں سے

نجات پا چکی ہے۔ سیاست کی مذہبی تعبیر مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن وہ معاشرے کو خود اپنے آپ سے اور دوسروں کے جائزوں سے مخفی رکھتی ہے۔ یہ دینی سیاسی نظام ایک مکافات عمل کا شکار ہو چکا ہے۔

مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کیلئے اسلام پسندی کے عروج کے بعد کا دور شاید زیادہ مشکل ہوتا لیکن ان کا موجودہ طریق کار یعنی سیاسی اور معاشی اصلاحات کے ذریعے حالات کو سنبھالنے کی بجائے اسلام سے بے نیاز طبقوں کی جانب سے جوابی تحریک برپا کر دینا زیادہ آسان ثابت ہوا ہے۔ اسلام پسندوں کی طرف سے تقویٰ اور پرہیز گاری پر مبنی، رنگینیوں سے خالی طرز زندگی سے خائف ہو کر متوسط طبقات نے مطلق العنان طرز حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔ عربوں کے سیاسی کلچر میں جلد اصلاح کا عمل شروع ہوگا۔ اس کے احیاء کے لئے مصر تمام عرب ممالک میں سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس کے معاشرے کو صحیح معنوں میں سیاسی تجربہ حاصل ہے۔ بحیثیت مجموعی اس کا مزاج معتدل ہے اور اسے ایک مرکزی سیاسی نظام کا تحفظ بھی حاصل ہے۔ اسی ملک میں اس بات کا امکان پایا جاتا ہے کہ ذمہ دارانہ سیاسی حکمرانی اور تباہ کن اپوزیشن کے درمیان کشمکش کا لامتناہی سلسلہ ختم ہو جائے اور ایک میانہ روی پر مشتمل سیاسی اور سماجی نظام قائم ہو سکے۔ یہی نظام عربوں کے لیے ایک رواداری کی اقدار کے حامل نظام کا نمونہ بن سکے گا۔

امریکی بالادستی - شیطان کی تلافی مافات

ناکامی کی وجوہات کو سیاسی اور مذہبی لبادے پہنائے جا سکتے ہیں لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ عرب دانشور تاریخ کی اس تعبیر سے جس کے تحت ہر الزام مغرب کے سر تھوپا جا سکتا ہے جان چھڑا لیں۔ یہ نہایت دشوار مرحلہ ہوگا اور اس کے امکانات کم ہیں۔ کیونکہ عرب دنیا میں یہ خیال عام ہے کہ جدید عالمی نظام اپنی جزئیات کے اعتبار سے امریکی سانچے میں ڈھلا ہوا اور اسی کی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے۔ بحرالکاہل کے علاقے میں اس تصور کی کوئی پذیرائی نہیں دوسری طرف مشرقی ایشیا میں ایک طرح کی خود اعتمادی پائی جاتی ہے جس کے تحت یہ تصور عام ہے کہ وہاں کے

سیاسی اور معاشرتی تصورات کا خمیر خود ان کی اپنی ثقافت سے اٹھا ہے۔ اس کے برعکس عربوں میں اس خود اعتمادی کا فقدان ہے۔

عرب دنیا پر امریکی بالادستی کی پرچھائیں ہر شعبہ زندگی پر پڑ رہی ہے اور اس کے خلاف دانشور طبقے میں کشیدگی ابھر رہی ہے۔ عرب قومیت اور ناصرازم کے موثر ترین مصری ترجمان محمد حسین ہیکل نے حال ہی میں ان ہی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عالمی نظام کے جدید امریکی تصور سے عربوں کو اس سے زیادہ نقصان پہنچے گا جتنا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد عرب دنیا کے حصے بخرے کرنے سے ہوا تھا۔ مصر میں جتنی بھی معاشی اصلاحات نافذ کی گئی ہیں عرب قومیت کے حامی دانشور امریکی دباؤ کے سامنے جھک جانے اور اس معاشی ترقی کو برباد کر دینے کے مترادف قرار دیتے ہیں جو عرب قومیت اور ناصرازم کے دور عروج میں حاصل ہوئی تھی۔

عرب دنیا میں امریکی قوت کی موجودگی نے ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا کر دی ہے۔ امریکہ کی اس علاقے میں موجودگی انیسویں صدی کے اواخر سے مشنریوں اور معلموں کی صورت میں شروع ہوئی۔ اس وقت سے اب تک یہ بیک وقت شیطانی قوت اور دوسری طرف اس کے اثرات کو زائل کرنے والی عرب قومیت کو پروان چڑھانے والی اور ادھر اسرائیل کی بقا کی ضامن اور اپنے پاپ کلچر اور تہذیبی اثرات سے معاشرے کو قدیم قدغنوں سے آزادی بخشنے والی لیکن اپنا پورا سیاسی وزن حکمرانوں کے پلڑے میں ڈالنے والی ثابت ہوئی ہے۔

عربوں کے سیاسی افکار پر اسرائیل بھی چھایا ہوا ہے۔ عرب قومیت کے عروج کے زمانے میں ہر ناکامی کا بہانہ اسرائیل کو بنایا جاتا رہا ہے، لیکن اب یہ سلسلہ مدھم پڑ چکا ہے۔ اس ذہنی دباؤ سے نکلنا بھی ضروری ہے۔ بدقسمتی سے حالیہ اوسلو معاہدے کے بارے میں عرب دانشوروں کا نقطہ نظر بہت ناقدانہ رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یاسر عرفات، مصر اور اردن نے مل کر امریکی بالادستی کے سامنے ہتھیار پھینک دیے ہیں اور اس طرح اسرائیل کے خلاف کشمکش میں اپنی ہار تسلیم کر لی ہے۔

عربوں نے اسرائیل کے وجود کو تسلم کرنے کے معاہدے کی قانونی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا وہ اسے صرف حکمرانوں کا معاہدہ قرار دیتے ہیں۔ اسرائیل سے بقائے باہمی سے فرار ممکن نہیں لیکن

عربوں کے پیشہ ور مرد وزن، دوسرے ملکوں میں آباد دانش ور، علمی دنیا کے رہنما جن میں سیکولر اور اسلام پسند سب شامل ہیں، اسرائیل کے ساتھ امن کو دلی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان ناقدین کے نقطہ نظر سے یہ سارا عمل اسرائیلی بالادستی یا اسرائیل امریکہ گٹھ جوڑ کا ایک ایسا منصوبہ تھا جس کے سامنے کمزور دل عرب حکمرانوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ اوسلو کے معاہدہ کے بعد ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یاسر عرفات پر غداری کے وہ الزامات چسپاں کئے جانے لگے جو اس سے پہلے اردن کے شاہ عبداللہ اور انور سادات کا مقدر تھے۔ گویا یاسر عرفات نے اس معاہدے کے نتیجے میں ۱۹۴۸ء کے ان مہاجرین کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جو ہمیشہ اس کے حمایتی رہے تھے۔ جعفہ اور حیفہ کے علاقوں سے دستبردار ہو کر غزا اور دریائے اردن کے مغربی کنارے پر اکتفا کر لیا تھا۔ اب یہی فلسطینی مہاجر اس امن معاہدے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

ادھر دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزا میں ایک کھچڑی پک رہی ہے۔ نام نہاد ہی سہی لیکن ایک فلسطینی ریاست کے خطوط ابھرے ہیں اور اسرائیل بھی روایتی صہیونیت کے چکر سے نکلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ لیکن عربوں کی سوچ کا مرکزی دھارا۔ ان تبدیلیوں سے صرفِ نظر کرتا ہوا عربوں کے گمنام ورثے کا متلاشی ہے۔ عرب اتحاد کے خواب کی تعبیر اور دوسرے ممالک میں عرب مہاجروں کی واپسی تشنہ تکمیل ہیں۔ غم واندوہ اور انتشار کی کیفیت حاوی ہے۔ اسرائیل سے مخاصمت عرب قومیت کے جذبات کو زندہ رکھنے کا ایک موثر ذریعہ رہی ہے۔ اب جب دنیا نے عربوں سے ان کا ہر قیمتی ورثہ چھین لیا ہے، عرب اس جذبہ مخاصمت سے کیسے دستبردار ہو سکتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ الجزائر جیسے دور افتادہ عرب ملک میں فرانسیسی استعمار کے خلاف جنگ میں مدد دینے کے لئے پوری عرب دنیا کے سکولوں میں چندہ جمع کرنے کے بکس آویزاں تھے۔ اور الجزائر کی آزادی پر پوری عرب دنیا فرحاں و نازاں تھی۔ آج کا الجزائر ایک بالکل دوسرے خطرے سے دوچار ہے۔ دور جدید میں عربوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے لیکن وہ ایک ناقابل تردید حقیقت سے شناسا ہو چکے ہیں اور وہ یہ کہ اب عربوں کا مستقبل اور تقدیر خود ان کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔